# پاکستان میں جمہوری کلچر کیوں مستحکم نہ ہوسکا

حرفِ تمنا

☆☆☆☆☆

ارشاد احمد حقانی

''فوکس پاکستان'' نامی تنظیم کے زیر اہتمام ''موجودہ حالات میں ہماری قومی ترجیحات'' کے عنوان سے اظہار خیال کرتے ہوئے ممتاز پاکستانی شخصیات نے اپنے اپنے انداز میں ملک کو درپیش مسائل کا تجزیہ کیا ہے اور ان کے حل کے لئے تجاویز پیش کی ہیں۔ سابق گورنر اور ریٹائرڈ جنرل معین الدین حیدر نے بالکل درست کہا ہے کہ پاکستان کے تمام مسائل باہم منسلک اور مربوط ہیں یعنی کسی ایک مسئلے کو الگ تھلگ کر کے نہ تو صورت حال کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی قابل عمل حل تجویز کیا جا سکتا ہے۔ ایک اور مقرر ممتاز قانون دان ایس ایم ظفر نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ پاکستان کی تاریخ کے بڑے حصے میں انتظامیہ نے عدلیہ کو آزادی سے کام نہیں کرنے دیا جس کی وجہ سے عدلیہ عوام میں اپنے وقار اور اعتماد سے محروم ہوگئی ہے۔ انہوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ پاکستان میں حکومت کی تبدیلی کے ہر عمل کے نتیجے میں ججوں کو عدالتوں سے قبل از وقت رخصت ہونا پڑتا ہے اور انہیں گھر بھیج دیا جاتا ہے جبکہ جرنیل جو اقتدار پر قبضہ کرتے ہیں اپنے مناصب پر فائز رہتے ہیں اور ملک کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے اس بات پر بھی افسوس کا اظہار کیا کہ ججوں کے تقرر کا طریق کار شفاف نہیں ہے اور اعلیٰ عدلیہ میں تعیناتی کرتے وقت بہت سے عوامل اور عناصر اور دباؤ روبہ عمل آ جاتے ہیں اور میرٹ کی بنیاد پر تقرریاں ہمیشہ ممکن نہیں ہوتیں۔ قومی اسمبلی کے ایک سابق سپیکر، سابق وفاقی وزیر اور ایک ممتاز سیاستدان سید فخر امام نے اس بات پر دکھ اور افسوس کا اظہار کیا کہ ہم 57 سال گزرنے کے باوجود ملک میں ایک قابل عمل اور متفقہ سیاسی نظام قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ انہوں نے تمام اختیارات ایک دو طاقتور شخصیات کے ہاتھوں میں مرتکز رہنے پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ اختیارات کی تقسیم معروف اور مسلمہ جمہوری اصولوں کے مطابق ہونی چاہئے اور ملکی نظام کو قاعدے قانون اور دستور کا پابند ہونا چاہئے۔

لاہور کی تقریب کے مقررین کی باتیں وزنی اور قابل قدر ہیں اور ہر شخصیت کے تجزیئے میں صداقت کا ایک عنصر ہے لیکن سب سے زیادہ صائب بات یہ ہے کہ پاکستان کے تمام مسائل باہم منسلک اور مربوط ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرہ ایک نامی (Organic) وجود ہوتا ہے۔ اس کے اکثر و بیشتر اجزا قریب قریب ایک ہی سطح کی کارکردگی پیش کرتے ہیں۔ ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کہ کسی معاشرے کا کوئی ایک عضو یا ایک ادارہ تو مثالی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا ہو جبکہ دوسرے اعضا اور ادارے ناقص اور غیر تسلی بخش رویوں کے حامل ہوں۔ پاکستان میں انتظامیہ نے اگر اکثر و بیشتر وقت دوسرے اداروں بالخصوص عدلیہ کو دبا کر رکھا ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عدلیہ خود بھی اپنی آزادی اور اپنے وقار کا پوری طرح تحفظ کرنے میں ناکام رہی ہے۔ عدلیہ پر انتظامیہ کے غلبے کا عمل ہمارے ہاں مولوی تمیز الدین کیس سے شروع ہوا۔ اس وقت اگر ہماری اعلیٰ عدلیہ بالخصوص چیف جسٹس محمد منیر انتظامیہ کا غلبہ اور دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیتے اور اسمبلی کی برطرفی کو کالعدم کر دیتے تو شاید ہماری پوری تاریخ مختلف ہوتی۔ انہوں نے یہ فرض کر لیا کہ انہوں نے گورنر جنرل کے فیصلے اور حکم کو خلاف قانون قرار دیا تو انتظامیہ ان کا فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کر دے گی اور ملک انارکی کی گرفت میں آ جائے گا۔ ضروری نہیں تھا کہ گورنر جنرل کے حکم کو کالعدم قرار دینے کا نتیجہ وہی ہوتا جس سے خائف ہو کر جسٹس منیر نے اسمبلی کی تحلیل کو جائز قرار دیا۔ مولوی تمیز الدین کیس عدلیہ اور انتظامیہ کی تقابلی طاقت کا پہلا امتحان تھا، ایک ٹیسٹ کیس تھا جس میں عدلیہ شکست کھا گئی اور اس نے بلطاف انتظامیہ کے حکم کو قانونی اور جائز قرار دینے کا راستہ نکال لیا۔ کاش جسٹس منیر نے یہ راستہ اختیار نہ کیا ہوتا۔ گورنر جنرل غلام محمد سے جسٹس منیر کے خصوصی تعلقات اور رابطوں کی اطلاعات کو نظر انداز بھی کر دیا جائے نیز یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ جسٹس منیر کی نیت نیک تھی اور ان کے پیش نظر واقعی ملک کا مفاد اور عملی مشکلات تھیں تو بھی یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ جسٹس منیر سے ایک فاش اجتہادی غلطی سرزد ہوئی جس کے نتیجے میں ہماری قانونی اور سیاسی عمارت کی پہلی اینٹ ہی غلط رکھ دی گئی۔ اس پر جو دیوار تعمیر ہوئی پھر اسے لامحالہ ٹیڑھا ہی ہونا تھا۔ جسٹس منیر نے پاکستان پر دوسرا ظلم یہ کیا کہ 1958ء کے مارشل لا کو نظریہ ضرورت کے تحت جائز قرار دے دیا اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو کسی مدت معین کے اندر انتخابات کرانے کا پابند بھی نہ کیا۔ اس سے انتظامیہ کی بالادستی کی ایک روایت قائم ہوگئی جس سے ہم آج تک چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ جس انتظامیہ کو بالادستی ملی وہ سویلین اور سیاسی بھی نہیں تھی فوجی تھی۔ اس سے پاکستان کے قومی امور میں فوج کی بالادستی کی روایت کا آغاز ہوا جس سے ہم آج تک نجات حاصل نہیں کر سکے۔ جنرل ضیاء نے جولائی 1977ء میں بھٹو کی حکومت کو معزول کر کے مارشل لا نافذ کیا تو انتخابات غیر معینہ عرصے کے لئے ملتوی کئے جا سکتے ہیں اور ان کے تابع مہمل کا کردار ادا نہیں کریں گے۔ انہوں نے ایک عمل کیا ہے اب وہ جب تک چاہیں انتخابات کے بغیر مارشل لا حکم کے ذریعے ایک آئینی ترمیم کو کالعدم کر کے جسٹس یعقوب علی خان کو فارغ کر دیا اور ان کی جگہ جسٹس انوار الحق کو تعینات نہ ہو سکے۔ جسٹس انوار الحق نے جس انداز میں چیف جسٹس بنا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جسٹس انوار الحق کی صدارت میں جب سپریم کورٹ کے ججوں کا پہلا اجلاس ہوا تو نہ صرف ان کے ساتھی ججوں میں سے کسی کا احتجاج کم اور کم ریکارڈ پر نہیں کسی جج نے جنرل ضیاء الحق کے اقدام پر تنقید نہ کی بلکہ ہے۔ عدلیہ نے بینظیر کی دونوں حکومتوں کی برخواستگی کو بھی حق اکثریت نے اس کا خیر مقدم کیا اور جسٹس انوار الحق کو مبارکباد دی۔ جونیجو صاحب کی اسمبلی کی برطرفی ناجائز قرار دی حالانکہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے جب صدور کی متعلقہ جانے والی تھی کہ آرمی چیف کے اشارے پر فیصلہ بدل کیا۔ آئینی ترمیم کو کالعدم کیا تھا اس وقت انہیں کسی عدالت کی طرف صرف میاں نواز شریف کی پہلی حکومت کی برطرفی کو سپریم بھی دستور میں ترمیم کرنے کا اختیار حاصل بھی نہ ہوا تھا۔

ں انوار الحق نے نصرت بھٹو کیس میں ایک دفعہ پھر نظریۂ رت کا سہارا لیا اور مارشل لا کو جائز قرار دے دیا حالانکہ اس پہلے خود سپریم کورٹ جنرل یحییٰ خان کو غاصب قرار دے ئی لیکن جسٹس انوار الحق کی سپریم کورٹ نے عاصمہ جیلانی ں جس میں یحییٰ خان کو غاصب قرار دیا گیا تھا کو نظر انداز نے اور ہائی پاس کرنے کا راستہ تلاش کر لیا۔ روایت ہے کہ ت بھٹو کیس کا جو فیصلہ لکھا گیا تھا اور جس پر تمام ججوں نے ط کر دیئے تھے ابھی وہ ایک آدھ روز میں سنایا جانے والا تھا جسٹس انوار الحق ایک اعلیٰ سطحی ضیافت میں شریک ہوئے ں ایک جرنیل نے ان سے علیحدگی میں پوچھا، کیا آپ اپنے ے میں سی ایم ایل اے کو آئین میں ترمیم کا اختیار بھی دینے لے ہیں۔ جب جسٹس انوار الحق نے اثبات میں جواب نہ دیا کورہ جرنیل نے ان سے کہا ''ایسی صورت میں تو ہمیں کوئی سرا چیف جسٹس تلاش کرنا پڑے گا''۔ کہا جاتا ہے کہ جسٹس ار الحق اسی وقت ضیافت چھوڑ کر اپنے دفتر آئے۔ رات کا ت تھا، دفتر کھلوایا اور پہلے سے تیار شدہ فیصلے کے آخر میں سی ایل اے کو روزمرہ کی مشکلات کا ازالہ کرنے کی ضرورت نام پر آئین میں ترمیم کا اختیار دے دیا۔ مزید برآں صدر اء الحق کے اس واضح اعلان کے باوجود کہ وہ 90 روز میں خابات کرائیں گے سپریم کورٹ نے انہیں کسی مدت معینہ ے اندر انتخابات کرانے کا پابند بھی نہ کیا اور صرف اس بزرویشن پر قناعت کر لی کہ ''عدالت کو امید ہے کہ جس قدر لد ممکن ہوگا انتخابات کرائے جائیں گے''۔ یہ الفاظ لکھنے لے کو بھی علم تھا کہ یہ ایک چور دروازہ ہے جس کا فائدہ اٹھا کر ں نے جنرل ضیاء الحق کا پہلا اجلاس ہوا تو نہ صرف ان کے ساتھی ججوں میں سے کسی کا احتجاج کم اور کم ریکارڈ پر نہیں

کورٹ نے ناجائز قرار دیا اور اس کے فیصلے پر آدھے گھنٹے میں عمل ہو گیا۔ کاش جسٹس نسیم حسن شاہ کے پیشروؤں نے بھی مصلحت کوشی کا راستہ اختیار نہ کیا ہوتا اور اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا ہوتا۔ نسیم حسن شاہ کی سپریم کورٹ کے فیصلے سے زمین شق ہوئی نہ آسمان پھٹا۔ فیصلے پر بالکل ہموار طریقے سے عمل ہو گیا۔ کچھ عجب نہیں کہ جسٹس منیر اور جسٹس انوار الحق بھی مختلف فیصلے دیتے تو ان پر بھی عمل ہو جاتا۔ ظفر علی شاہ کیس میں (نواز حکومت کی دوسری برطرفی) سپریم کورٹ نے اتنی مہربانی کی کہ انتخابات کے لئے تین سال کی مدت معین کر دی اگرچہ حکومتی وکلا کے مانگے بغیر نئی انتظامیہ کو آئین میں ترمیم کا حق بھی دے دیا گیا۔ پھر جناب ایس ایم ظفر شکایت کرتے ہیں کہ انتظامیہ نے عدلیہ کو دبا کر رکھا۔ انتظامیہ اور وہ بھی فوجی انتظامیہ کا تو مزاج ہی یہ ہے کہ من مانی کرے دوسروں کو اپنے آگے جھکنے پر مجبور کرے۔ اس کا شکوہ کرنا تو سعی لاحاصل ہے۔ دوسرے ریاستی ادارے یا ان میں سب سے معزز ادارہ یعنی عدلیہ استقامت اور مقاومت کا ثبوت دیتا تو شاید انتظامیہ کے بے لگام گھوڑے کو بھی کسی مرحلے پر نکیل پڑ جاتی۔ غالب نے سچ کہا ہے:

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا۔
عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

لاہور کی مذکورہ تقریب میں مقررین نے بجا طور پر اس امر پر دکھ کا اظہار کیا کہ ہم ابھی تک کوئی پائیدار سیاسی نظام قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ہماری سیاسی کلاس بھی اس کردار اور اس وژن کی حامل نہ تھی جو ایک نوآزاد ترقی پذیر ملک میں محکم جمہوری کلچر رائج کرنے کے لئے مطلوب تھے۔ بقول جنرل معین الدین حیدر پاکستان کے تمام مسائل باہم مربوط اور منسلک ہیں اور ہم انہیں حل کرنے میں اسی وقت کامیاب ہوں گے جب تمام ادارے اور ان کی نمایاں شخصیات فکر و عمل کی بہتر صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کے قابل ہوں گے۔ میں مایوس نہیں ہوں بلکہ سمجھتا ہوں کہ ایک ارتقائی عمل کے نتیجے میں ہم قدم بقدم بہتر کارکردگی دکھانے کی استعداد اپنے اندر پیدا کر رہے ہیں۔ اکتوبر 2002ء کے انتخابات کے بعد پارلیمنٹ اور تمام متعلقہ حلقوں کی غیر معیاری کارکردگی کے باوجود پاکستان میں جمہوری کلچر رائج کرنے کی جدوجہد پہلے سے زیادہ موثر اور توانا ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے اثرات بہرحال مرتب ہوں گے۔